سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۴۵
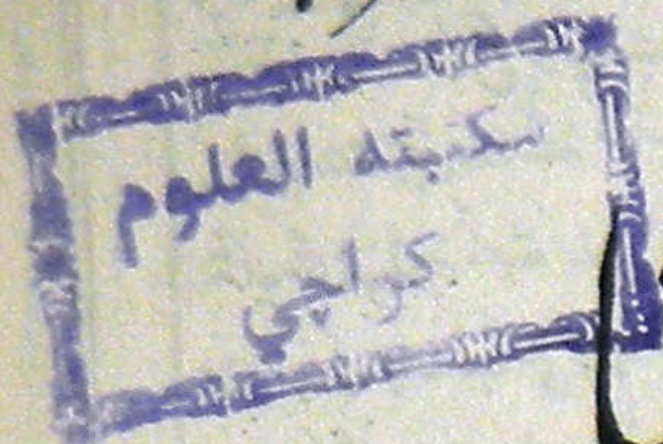
علیہ السلام
امام رضا

شہنشاہِ خراسان، سلطان العرب والعجم، امام ضامن ابوالحسن علی ابن موسیٰ الرضا علیہ التحیۃ والثناء علیہ السلام کے سوانح حیات کا مختصر خاکہ

از قلم حقیقت رقم

سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی
مجتہد العصر لکھنؤ

قیمت ۲ آنے

امامیہ مشن پاکستان کی

کا پینتالیسواں (۴۵) تبلیغی رسالہ "امام رضاؑ" آٹھویں امام کے حالات پر مشتمل آپکے زیر مطالعہ ہے۔ لکھنؤ مشن سے
یہ رسالہ زیر نمبر ۱۰۶ شائع ہو چکا ہے۔ یہ وہ امامؑ ہیں جنکے سامنے وسیع سلطنت کے ولیعہدی کی حیثیت
کے اختیارات پیش کئے گئے مگر آپ نے کمال شانِ استغنا سے انکو ٹھکرا کر اسلام کی سادہ زندگی کو
رشکِ شاہانِ زمانہ ثابت کر دیا۔ اور فقیری میں بادشاہی کی۔ آج ایران کے شہنشاہ آپ کے
مرقد منور کی جاروب کشی کو اپنا طرۂ افتخار جانتے ہیں۔ عزاداری حسینؑ مظلوم کی اشاعت میں
آپکا لائحہ عمل ہمارے لیے روشن مثال ہے جسکی تاسی میں ہم تمام عالم کو پیغام حسینؑ سے منور کرنے
کی عملی ہدایت پاتے ہیں۔

اراکین امامیہ مشن نے چودہ معصومینؑ کی مختصر سوانح حیات کا "سنہری سلسلہ" شائع کر کے ایک اہم
تبلیغی ضرورت کو پورا کیا ہے چند صفحات میں ضروری واقعات کو سمیٹ کر کوزہ میں دریا بند کر دیا
ہے۔ ان اجمالی خطوط کی تفصیل مبسوط کتاب کا منشا پورا کر سکتی ہے۔ نظامِ اسلام میں چہاردہ معصومینؑ
کی ذواتِ مقدسہ کی اہمیت و عظمت کی یہ شان ہے کہ ان حضرات کی معرفت، محبت اور
اطاعت ہر انسان پر واجب و لازم ہے۔

اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ ان بزرگواروں کے حالات پر بلند پایہ لٹریچر کی مختلف زبانوں میں
اسقدر فراوانی ہوتی کہ تمام اقوام عالم ان سے متعارف ہو سکتیں لیکن حالت یہ ہے کہ اردو زبان
میں بھی مناسب و موزوں لٹریچر کی کمی مزید برآں بچوں اور کم علم لوگوں نیز مستورات کیلئے آسان
زبان میں لٹریچر کی کمیابی ان تمام مشکلات کا سرکار سید العلماء مدظلہ العالی نے بجامع آسان اور
اختصار نویسی سے جو عبوری حل ان رسائل کی شکل میں کر دیا ہے اس کیلئے سرکار ممدوح انتہائی
تشکر یہ کے مستحق ہیں۔

لاریب معصومینؑ کی ذواتِ مقدسہ خدا تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اور ان حضرات کے
تعارف کے لیے یہ سلسلہ اشاعت بھی نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ابنائے ملت سے التماس ہے
کہ ان رسائل کو نہ صرف اپنے لیے خریدیں بلکہ مشن سے رعایتی قیمت پر حاصل کر کے اپنے
ماحول میں مفت تقسیم کرنیکا اہتمام فرمائیں تاکہ تبلیغ دین کے اجر کے مستحق بن سکیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ایک عملی مذہب ہے اور وہ اس دنیا میں رہ کر دین کے راستے پر قائم رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اس کا راستہ بال سے زیادہ باریک ہو گیا ہے کیونکہ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر دامن کو بچائے رکھنا کوئی دشوار امر نہیں ہے لیکن ابنائے دنیا کے اندر رہتے ہوئے ہر ہر قدم پہ اپنے مالک کی مرضی کو پیشِ نظر رکھنا اور پھر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبا نہ آنے دینا بڑا سخت کام ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے ان رہنمایانِ دین کی سیرت زندگی کو غور سے دیکھنے کی جنہیں ہر طرح کے نرم اور گرم حالات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کبھی گوشۂ تنہائی میں زندگی گزارنا پڑی اور کبھی اپنی طبیعت کے خلاف دنیاوی سلطنت کے ماحول اور دنیاوی سیاست کے اندر قدم رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کرتے رہے جس کے لئے وہ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ آلِ محمدؐ کے سلسلہ کی یہ دسویں کڑی حضرت امام رضا علیہ السّلام کے مقدس حالات میں اسی لئے پیش کی جا رہی ہے

نام و نسب

علیؑ نام رضا لقب اور ابوالحسنؑ کنیت ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام والد بزرگوار تھے اور اس لئے آپ کو پورے نام و لقب کے ساتھ یاد کیا جائے تو امام ابوالحسن علیؑ ابن موسیٰ الرضا علیہ السّلام کہا جائے گا۔ والدہ گرامی کی کنیت ام البنین اور لقب طاہرہ تھا۔ نہایت عبادت گزار بی بی تھیں۔

ولادت

۱۱ ذی القعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں حضرت کی ولادت ہوئی۔ اسی کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵ شوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السّلام کی وفات ہو چکی تھی۔ اتنے عظیم حادثۂ مصیبت کے بعد جلد ہی اس مقدس مولود کے دنیا میں آ جانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلی محسوس کی گئی۔

تربیت

آپ کی نشو و نما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زیر سایہ ہوئی اور اسی مقدس ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں اور پینتیس ۳۵ برس کی عمر پوری ہوئی۔ اگرچہ آخری چند سال اس مدت کے وہ تھے جب امام موسیٰ کاظم عراق میں قید ظلم کی سختیاں برداشت کر رہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۴ یا ۲۹ برس آپ کو برابر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

جانشینی

امام موسیٰ کاظمؑ کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس نہ لینے دیگی اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کی عمر کے آخری حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستان اہلبیتؑ کا آپ سے ملنا یا بعد کے لئے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جائیگا۔ اسلئے آپ نے انہی آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جبکہ آپ مدینہ میں تھے پیروان اہلبیتؑ کو اپنے بعد ہونیوالے امام سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی چنانچہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں سے سترہ ۱۷ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے انہیں جمع فرما کر اپنے فرزند حضرت علی رضاؑ کی وصایت اور جانشینی کا اعلان فرما دیا۔ اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی۔ یہ اہتمام دوسرے آئمہؑ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ صرف ان خصوصی حالات کی بنا پر جن سے دوسرے آئمہؑ اپنی وفات کے موقعہ پر دوچار نہیں ہونے والے تھے۔

دورِ امامت

حضرت امام رضا علیہ السلام کی پینتیس برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داریاں آپکی طرف منتقل ہوئیں یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون الرشید تخت خلافت پر تھا اور بنی فاطمہؑ کے لیئے حالات بہت ناسازگار تھے۔ اس ناخوشگوار ماحول میں حضرت نے

خاموشی کے ساتھ شریعتِ حقہ کے خدمات انجام دینے شروع کر دیئے۔

علمی کمال

آلِ محمدؐ کے اس سلسلہ میں ہر فرد حضرت احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دیا گیا تھا جسے دوست اور دشمن سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانہ نے کم موقع دیا اور کسی کو زیادہ۔ چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ حضرت امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ "تمہارے بھائی علی رضا عالم آلِ محمدؐ ہیں" اپنے دینی مسائل کو ان سے دریافت کر لیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپ مدینہ میں تھے اور روضۂ رسولؐ پر تشریف فرما رہتے تھے تو علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ یقطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے اور آپ نے انکا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیے تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

زندگی کے مختلف دور

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا یقیناً وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح پر برداشت نہیں کر سکتا تھا جس طرح اس کے پہلے آپ کے والد بزرگوار کا رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس سے حکومت وقت کی عام بدنامی ہو گئی تھی اور یا واقعی ظالم کو خود اپنی بدسلوکیوں کا احساس اور ضمیر کی طرف سے

ملامت کی کیفیت تھی۔ جس کی وجہ سے کھلم کھلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی
گئی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحییٰ ابن خالد برمکی نے اپنے اثر اور رسوخ کے
بڑھانے کے لئے یہ کہا بھی کہ علیؑ ابن موسیٰؑ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی
طرح دعویدار ہیں تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے ان کے باپ کے ساتھ کیا
وہی کیا کم ہے جواب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کر دوں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہلبیتِ رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو
برتاؤ اب تک رہا تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمّال حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت
. . . . کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہلبیت کے ساتھ کوئی اچھا رویہ
رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ امام کے پاس آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کے
لئے آسکتے تھے نہ حضرت کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے
لطفی میں گزرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندانِ شاہی سے منصور دوانیقی کی پوتی تھی۔ اور
اس لئے عرب سردار سب اسکے طرفدار تھے اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ سے تھا۔ اس
لئے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ دونوں کی آپس کی رسہ کشی ہارون کے
لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اسکا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ
یوں کر دیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام، مصر
حجاز، یمن وغیرہ محمد امین کے نام کئے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران، خراسان، ترکستان
وغیرہ مامون کے لئے مقرر کئے۔ مگر یہ تصفیہ تو اس وقت کارگر ہو سکتا تھا جب دونوں فریق
"جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہ کے خلاف ہر طرح کے ظلم و تعدی کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے تو خود بنی عباس میں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کاروائیاں کرنے پر تیار نظر آئے۔ . . . .

اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جبکہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور اتحاد اور خلق خدا کی خیر خواہی کا بھی حامل نہیں ہے۔ جسے بنی فاطمہ اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کر لیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خونریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدود سلطنت پر قائم ہو گئی

ولی عہدی

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے پائے نام ہو گئی۔ مگر یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکان سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ ایک غم و غصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر طرف خطرہ لگا ہوا تھا۔ اولادِ فاطمہؑ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے رہتے تھے وہ خواہ قتل کر دیئے گئے ہوں۔ یا جلاوطن کیے گئے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں۔ ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی۔ جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکتی تب بھی دل ہی دل میں حکومت بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا - وہ ان مظالم ہی کو
یاد دلا کر جو بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے بنی فاطمہ کے ساتھ ہوئے
تھے اس سے ایران میں اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا - درمیان میں بنی
عباس نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا - مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی
کھلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کہا کیا گیا تھا اور اقتدار کن لوگوں نے حاصل کر لیا - ممکن ہے کہ
ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچا مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو - اب جب تک کہ امین کے
قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور اسے ہر وقت
اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا تو اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے
خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہ کو اپنا بنایا جائے - اور چونکہ طرز عمل میں خلوص
سمجھا نہیں جا سکتا اور وہ عام طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا - اگر یہ نمایاں ہو جائے کہ وہ سیاسی
مصلحتوں کی بنا پر ہے - اس لئے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور
ولائے اہلبیت کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے - "اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک
نیتی سے اب "حق بحق دار رسید" کے مقولہ کو سچا بنانا چاہتا ہے -

اس سلسلہ میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس
نے اپنی نذر کی حکایت بھی شائع کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت نازک حالت
تھی اور عین اسی وقت میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہو گئی تھی اور
خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف
سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور
منت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں اور میں خلافت تک پہنچوں تو اس کو اسکے

اصلی حقدار یعنی اولادِ فاطمہؑ میں سے جو اس کا اہل ہے اس تک پہنچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی۔

یقیناً یہ واقعہ مامون کی طرف سے اسلئے بیان کیا گیا کہ اس کا طرزِ عمل خلوصِ قلب اور حسنِ نیت پر مبنی سمجھا جائے۔ یوں تو اہل بیتؑ کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے وہ بھی انکی حقیقت اور فضیلت سے واقف تھے اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شیعیت کے معنی صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعوائے شیعیت اور محبت اہلبیتؑ کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود خود امام کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ امامؑ کو اپنے منشأ کے مطابق چلانے کی کوشش تھی۔ ولی عہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کر دیا گیا اور آپ کو مجبور بنا دیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ولی عہدی کی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اسوقت شیعیت کے بھیس میں امام کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

امام علیہ السّلام کا اس ولی عہدی کو قبول کرنا بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہارون کے حکم سے امام موسیٰ کاظمؑ کا جیل خانہ چلا جانا۔ اسی لئے جب امام رضاؑ مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو آپ کے رنج، صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی۔ روضہ رسولؐ سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کے مدینہ سے روانگی کے موقعہ پر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بیتابانہ روضہ کے اندر جاتے ہیں۔ اور نالہ و آہ کے ساتھ امت کی شکایت کرتے ہیں۔ پھر باہر نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا۔ پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں یہی صورت

کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرت کے قریب گیا تو فرمایا اے محول!
میں اپنے جدِ امجد کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جا رہا ہوں۔ اب مجھ کو یہاں واپس
آنا نصیب نہ ہو گا۔

سنہ ۲۰۰ھ میں حضرت مدینہ منورہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوئے۔ اہل وعیال
اور متعلقین سب کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ
برس کی تھی۔ آپ بھی مدینہ ہی میں رہے (اس سفر کے مختصر حالات اور نیشاپور میں امام
کا استقبال اور حضرت کا خطبہ رسالہ "عہدِ مامون اور امام رضاؑ" میں جو امامیہ مشن سے
شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمائیے) جب حضرت مرو پہنچے جو اس وقت دارالسلطنت تھا تو
مامون نے چند روز ضیافت وتکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبولِ خلافت کا سوال پیش
کیا۔ حضرت نے اس سے اسی طرح انکار کیا۔ جس طرح امیر المومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت
پیش کئے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے۔ مامون کو خلافت سے دست بردار
ہونا درحقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امامؑ کو اسی پر مجبور کرتا۔ چنانچہ جب حضرت نے خلافت
کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولیعہدی کا سوال پیش کیا۔ حضرت اس کے
بھی انجام سے ناواقف نہ تھے۔ نیز بہ خوشی جابر حکومت کی طرف سے کوئی منصب
قبول کرنا آپ کے مذہبی اصول کے خلاف تھا۔ حضرت نے اس سے بھی انکار فرمایا۔
مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ
اس کو منظور نہیں کر سکتے تو اس وقت آپکو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔
جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر موقوف
ہو ورنہ حفاظتِ جان شریعتِ اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امام نے فرمایا "یہ ہے تو

میں مجبوراً قبول کرتا ہوں، مگر کاروبار سلطنت میں بالکل دخل نہ دونگا۔ ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائیگا تو نیک مشورہ ضرور دونگا۔" اس کے بعد یہ ولیعہدی صرف برائے نام سلطنت وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر امام کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو ان کے پیشرو حضرت علی مرتضیٰؑ اپنے زمانہ کی با اقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ جس طرح انکا کبھی کبھی مشورہ دے دینا ان حکومتوں کو صحیح وجائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضاؑ کا اس نوعیت سے ولیعہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ تھی جو اس طرح پوری ہو گئی۔ مگر امامؑ نے اپنے دامن کو سلطنت ظلم کے اقدامات اور نظم ونسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ انہوں نے بہت کچھ دراندازیاں کیں، مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضاؑ سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتا دو۔ اسکا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہوئے۔ مگر ظاہر ہے کہ امامؑ کے مقابلے میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہو سکتی تھی۔ مامون کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اسکے قائل کر سکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم ماہ رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسۂ ولیعہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی۔ پھر اور لوگ بیعت سے شرفیاب ہوئے۔

سونے اور چاندی کے سکّے سر مبارک پر نثار کیے گئے اور تمام ارکانِ سلطنت و ملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرتؑ کے نام کا سکّہ تیار کیا جائے چنانچہ درہم و دینار پر حضرت کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکّہ چلایا گیا۔ جمعہ کے خطبہ میں حضرت کا نام داخل کیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

مجبوری اور بے لبسی کا نام قناعت یا درویشی "عصمت بی بی از بے چادری" کے مقولہ کے مطابق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے۔ مگر ثروت و اقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردانِ خدا کا حصہ ہے۔ اہلبیت معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے اور اکثر یہ حضرات ایسے ہی تھے وہ عموماً اچھے لباس اور شان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ کیونکہ انکی فقیری کو دشمن بے لبسی پر محمول کر کے طعن و تشنیع پر آمادہ ہوتے اور خفانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی۔ مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے انھوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کر دیا تاکہ انکی زندگی غریب مسلمانوں کی تسلّی کا ذریعہ بنے اور ان کے لئے نمونۂ عمل ہو۔ جیسے امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؑ چونکہ شہنشاہ اسلام مانے جاتے تھے۔ اس لئے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جسکی مثال دوسرے معصومین کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے ولیعہد بنائے گئے تھے۔ جس کے وسعتِ مملکت کے سامنے روم و فارس کا ذکر بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہو گیا تھا۔ جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تھا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ "جا جہاں تجھے برسنا ہو برس

بہرحال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔"
حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت کی ولیعہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا۔ کہ دین والے اگر دنیا کو پا جائیں تو انکا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں امام رضاؑ کو اپنی دینی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زہد اور ترکِ دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنا دیں۔ جتنے تزک احتشام کے دنیاوی تقاضے زیادہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دہرایا اور علی رضاؑ کے لباس میں علی مرتضیٰؑ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھوانا پسند نہیں کئے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا۔ کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان، سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے ادب و آداب شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہو جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حواؑ اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اس کے عمل کے مطابق ہوگی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لیے ہو۔"
اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جزو بن کر جہاں صرف پیغمبرؐ کی طرف ایک قرابتداری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلق خدا پر حکمرانی کا حقدار بتایا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم و فسق و فجور میں بنی امیہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں ان سے آگے بڑھ گئے اور اس کے ساتھ پھر بھی قرابت رسولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر

داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر برابر زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا

عمل ہے۔

بظاہر صرف ایک شخص کا اظہار فروتنی اور انکسار نفس تھا جو بہر حال ایک اچھی

صفت ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریباً ایک صدی کی عباسی سلطنت

کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اصلاحی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بہت

اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام

رضاؑ کی سیرت میں اسکے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض

کی کہ "خدا کی قسم آباؤ اجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں"۔ حضرت

نے فرمایا۔ "میرے آباؤ اجداد کو جو شرف حاصل ہوا وہ بھی صرف تقویٰ، پرہیزگاری

اطاعت خدا سے۔" ایک شخص نے کسی دن کہا کہ "واللہ آپ بہترین خلق ہیں" حضرت

نے فرمایا۔ "اے شخص حلف نہ اٹھا جسکا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے

افضل ہے۔"

ابراہیم ابن عباس کا بیان ہے کہ حضرت فرماتے تھے۔ "میرے تمام لونڈی غلام

آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے تئیں محض رسول اللہ کی قرابت کی

وجہ سے اس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل جانوں (حضرت نے اشارہ کیا اپنے

ایک غلام کی جانب) ہاں جب عمل خیر بجا لاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہونگا۔"

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہیں، مگر خود حکومت

عباسیہ کا فرمانروا یقیناً اتنا کند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے، جو

امام رضاؑ کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اس کے خاندانی نظام سلطنت پر

برابر لگ رہے تھے۔ اس نے تو بخیالِ خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لئے حضرت کو ولیعہد بنایا تھا مگر بہت جلد اسے محسوس ہوا کہ اگر انکی زندگی زیادہ عرصے تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یکلخت انقلاب ہو جائیگا۔ اور عباسی سلطنت کا تختہ ہمیشہ کے لئے الٹ جائیگا۔

عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغ حق کے لئے نام حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے۔ مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ جب امام کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امام یا بحیثیت عالم دین آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ تو امام روحانی بھی ہیں اور ولیعہد سلطنت بھی۔ اس لئے آپ کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے۔ مرد کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ یہاں آتے ہیں اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے دوسروں کو بھی ترغیب و تحریص کی جانے لگی کہ "آلِ محمدؐ کے مصائب کو یاد کرو اور تاثرات غم کو ظاہر کرو۔"

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ "جو اس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں اس کا دل مردہ نہ ہوگا اس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔"

تذکرہ امام حسینؑ کیلئے جو مجمع ہو اسکا نام اصطلاحی طور پر "مجلس" اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کر دیں۔ جن میں

کبھی خود ذاکر ہوئے اور دوسرے سامعین۔ جیسے ریّان بن شبیب کی حاضری کے موقعہ پر جو آپ نے مصائب امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبداللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکر امام حسینؑ میں اشعار پڑھو۔ وہ ذاکر ہوئے اور حضرت سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبل کو حضرت نے بعد مجلس ایک قیمتی حلّہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حلّہ کی ضرورت نہیں ہے اپنے جسم کا اترا ہوا لباس مرحمت فرمائیے تو حضرت نے ان کی خوشی پوری کی۔ وہ حلّہ تو انہیں دیا ہی اس کے علاوہ ایک جبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقۂ کار کہ اسے کسی دنیاوی انعام کی خاطر یا معاذاللہ اجرت طے کر کے ذاکری نہیں کرنا چاہیئے اور بانیٔ مجلس کا طریقۂ کار کہ وہ بغیر طے کئے ہوئے کچھ بطور پیشکش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے۔ دونوں امر ثابت ہیں۔ مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصّہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔

وفات

مامون کے توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امامؑ کی جان لینے کا درپے ہو گیا اور وہی خاموش حربہ جو ان معصومین کے ساتھ اسے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جا چکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگور میں جو بطور تحفہ امام کے سامنے پیش کئے گئے تھے زہر دیا گیا اور اس کے اثر سے ۱۷ صفر ۲۰۳ھ میں حضرت نے شہادت پائی۔ مامون نے بہ ظاہر بہت رنج و غم کا اظہار کیا اور بڑے شان و شوکت کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے نزدیک دفن کیا۔

جہاں مشہد مقدس میں حضرت کا روضہ آج تاجداران عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیاوی شہنشاہ ہارون رشید بھی دفن ہے جس کا نام و نشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔